اپنی نمازوں میں عرفان الٰہی کے رنگ بھریں

سورۃ فاتحہ پر غور کرنے سے نماز کا ذوق حاصل ہوگا

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۴ ردسمبر ۱۹۹۰ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے فرمایا:

بچوں کو تصویر کشی کی تربیت دینے کے لئے بعض ایسی تصویروں کی کتب بھی دستیاب ہیں جن میں خاکوں کی صورت میں نقوش بنائے جاتے ہیں لیکن رنگ نہیں ہوتے اور بچے پھر اپنی مرضی اور مزاج کے مطابق، اپنی طبعی صلاحیتوں کے مطابق، اپنے ذوق کے مطابق ان میں رنگ بھرتے ہیں۔ اگر ایسی لاکھوں کتابیں بھی شائع کر دی جائیں اور لکھوکھہا بچوں کو تقسیم کر دی جائیں تو بظاہر تصویر ایک ہی ہوگی لیکن ہر بچہ جب اس میں رنگ بھرے گا تو نتیجہ مختلف نکلے گا۔ خواہ رنگ بھی ایک ہی قسم کے مہیا کئے جائیں لیکن ہر ایک اپنے ذوق، اپنے مزاج، اپنی صلاحیتوں کے مطابق رنگ بھرتا ہے اور تصویر مختلف روپ لے کر ظاہر ہوتی ہے۔

سورۂ فاتحہ کا جو میں پیچھے دو خطبوں میں ذکر کر چکا ہوں اس کی اور نماز کی باقی تمام ان عبارتوں کا یہی حال ہے جو ہم نماز میں پڑھتے ہیں۔ وہ سارے کلمات جو نماز میں ادا کئے جاتے ہیں ان میں رنگ انسان کو خود بھرنے پڑتے ہیں اور جہاں تک سورۂ فاتحہ کا تعلق ہے وہ تو خود بھی اپنی کیفیتیں اس طرح بدلتی رہتی ہے کہ زاویہ بدلنے سے اس کا اور رنگ دکھائی دیتا ہے اور ہر زاویے پر پھر بے شمار ایسے امکانات ابھرتے ہیں جن کی روشنی میں انسان سورۂ فاتحہ کی مدد سے مضامین تک

رسائی پاتا ہے اور مضامین کو جذبات میں ڈھال کر پھر سورۂ فاتحہ میں ایسی کیفیت کے رنگ بھرتا ہے جس سے سورۃ فاتحہ کوئی اجنبی چیز، بیرونی چیز نہیں رہتی بلکہ اس کے دل کی واردات بن جاتی ہے۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون کو نماز کے متعلق یوں بیان فرمایا کہ دیکھو نمازیں جو تم پڑھتے ہو ان میں الفاظ وہی ہیں جو سب پڑھتے ہیں لیکن کیفیتیں الگ الگ ہوتی ہیں اور کوئی نماز فائدہ نہیں دے سکتی جب تک تم اس کو اپنی کیفیت سے نہ بھرو۔ کیفیت سے بہتر اور کوئی لفظ اس منظر کی تصویر کشی نہیں کر سکتا، اس صورت حال کو بیان نہیں کر سکتا۔ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لفظ کیفیت رکھ کر تمام مضامین کو یہاں مجتمع کر دیا۔ کیفیت اس آخری احساس کا نام ہے جو مختلف چیزوں سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا خلاصہ کیفیت ہے۔ اگر سائنسی زبان میں اس کی بات کریں تو اگر چہ ہم مختلف تصویریں دیکھ رہے ہوتے ہیں یا مناظر دیکھ رہے ہوتے ہیں، خوشبوئیں سونگھ رہے ہوتے ہیں، لمس سے لذت پا رہے ہوتے ہیں اور اس طرح حواس خمسہ ہمارے لئے مختلف قسم کی دلکشیوں کے سامان لاتے ہیں لیکن آخری صورت میں وہ Electric Pulses ہیں جن میں تبدیل ہوتے ہیں اور بجلی کی وہ لہریں ہی ہیں جو ہمارے دماغ تک پہنچتی ہیں وہاں نہ رنگ پہنچتا ہے نہ خوشبو پہنچتی ہے نہ لمس سے کچھ حصّہ وہاں پہنچتا ہے نہ نمک کا احساس نہ میٹھے کا احساس جو کچھ پہنچتا ہے وہ بجلی کی لہروں کی صورت میں پہنچتا ہے، اس کا نام کیفیت ہے جو انسان محسوس کرتا ہے۔ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز میں لذّت پیدا کرنے اور افادیت پیدا کرنے کے لئے ہمیں یہ نسخہ عطا فرما دیا کہ وہ نمازیں جن میں کچھ کیفیت شامل ہوگی وہ کارآمد نمازیں ہیں۔ وہ نمازیں جو کیفیت سے خالی ہوں گی اُن سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور وہ ایسے برتنوں کی طرح ہیں جن میں کچھ بھی بھرا نہیں۔ پس نمازوں میں کیفیت پیدا کرنے کی خاطر مَیں آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ کون سی چیزیں کیفیت پیدا کرنے کے لئے مدد ہوتی ہیں۔ کیفیت از خود پیدا نہیں ہو جاتی۔ کیفیت کے لئے حواسِ خمسہ سے مدد لینا ضروری ہے اور حواس خمسہ جو پیغامات پہنچاتے ہیں وہ پیغامات دماغ کے مختلف حصّوں پر اثر انداز ہو کر کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

پس علم بڑھانا اور گہری نظر سے کائنات کا مطالعہ کرنا، خدا تعالیٰ سے شناسائی حاصل کرنا اور حواسِ خمسہ جو خدا نے عطا فرمائے ہیں اُن کے ذریعہ خدا کی حمد تک پہنچنا یہ وہ مضمون ہے جس کا زندگی

کے ہر لمحے سے تعلق ہے اور ہمارے گرد و پیش یہ مضمون بنتا چلا جاتا ہے اگر ہم ہوشمندی کے ساتھ محسوس کریں کہ ہم کیسے رہ رہے ہیں اور اپنے ماحول کے اثرات کو خدا تعالیٰ کی حمد کے ساتھ باندھنا سیکھ لیں پھر جب آپ نماز میں داخل ہوں گے تو وہ نماز کیفیتوں سے بھری ہوئی ہوگی۔ اگر نماز سے باہر کچھ نہیں ہے تو نماز کے اندر بھی کچھ پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے بعض لوگ جو یہ حیران ہوتے ہیں کہ ہم تو نماز میں داخل ہوئے تھے لذّتیں حاصل کرنے کے لئے ہمیں تو وہاں کوئی لذّت نہیں ملی باہر کی دنیا میں لوٹے اور پھر لذتوں میں دوبارہ کھوئے گئے۔ وہ بالکل درست کہتے ہیں کیونکہ باہر کی لذتوں کا خدا سے تعلق نہیں تھا اور اندر نماز خالی پڑی تھی اس لئے خالی ویرانے سے گھبرا کر وہ اُن لذتوں کی طرف لوٹتے ہیں جن کا خدا کی ذات سے تعلق نہیں ہے۔ یعنی تعلق ہے تو سہی مگر وہ سمجھے نہیں، رشتے تھے تو سہی مگر وہ باندھے نہیں گئے اس لئے وہ اس مادی دنیا سے لذّت پانے کی اہلیت رکھتے ہیں لیکن روحانی دنیا سے لذت پانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ پس اپنی سوچ کو انگیخت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ سوچ کے بغیر دل میں جذبات پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بعض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ قلبی کیفیت اور چیز ہے اور دماغ اور چیز ہے۔ حقیقت میں ایک دوسرے سے الگ ان کا وجود نہیں ہے۔ قرآن کریم نے سوچوں کے آخری مرکز کے طور پر فؤاد کا یعنی دل کا ذکر فرمایا ہے اور دلوں کو ہی اندھا قرار دیا اور دلوں ہی کو دیکھنے والا بیان کیا۔ جس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ دماغ کی آخری حقیقت بھی دل پر منتج ہوتی ہے اور آخری صورت میں چونکہ کیفیتیں بن جاتی ہیں اور کیفیتوں کا مرکز دل ہے۔ اس لئے قرآن کریم بھی دماغ کی بجائے دل کا ذکر کرتا ہے۔ پس اپنی سوچ کو بیدار کریں تو آپ کے دل میں عرفان کی لہریں دوڑنے لگیں گی اور عرفان کی لہریں ہی ہیں جو وہ کیفیت پیدا کرتی ہیں جس سے نماز میں لذت پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے محبت اور پیار بڑھتے رہتے ہیں۔

اب حواس خمسہ کا مَیں نے ذکر کیا ہے اس سے پہلے میں پچھلے خطبے میں David Attenborough کی ایک دو وڈیو کیسٹس کا ذکر کر چکا ہوں۔ مجھے بعد میں کسی نے بتایا کہ جو کچھ انہوں نے وڈیو کی صورت میں پیدا کیا ہے اس کو انہوں نے کتابی شکل میں بھی ڈھالا ہوا ہے اور ان کی تصنیف بھی ملتی ہے۔ مگر بہر حال یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہر کس و ناکس کی پہنچ میں نہیں اور نماز ہر شخص نے پڑھنی ہے تو بعض لوگوں کی رسائی ایسے مواد تک ہوتی ہے جن سے خدا تعالیٰ کے فضل کے

ساتھ اُن کا علم بڑھتا ہے اور اگر اُن کے اندر بصیرت ہو تو وہ اس علم کے بڑھنے کے ساتھ خدا تعالیٰ کی یاد میں بھی ترقی کرنے لگتے ہیں لیکن اگر دیکھنے کی طاقت ہی کچھ نہ ہو تو وہ علم الگ پڑا رہتا ہے اور خدا کا تصور الگ پڑا رہتا ہے اور ان دونوں کے درمیان رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ ساری دنیا تو اس قسم کے علم تک رسائی نہیں رکھتی اور وہ دنیا جو پہلے گزر چکی ہے جن میں ایسے زمانے شامل تھے جن میں خدا کے عظیم انبیاء گزرے جو خدا کو سب سے زیادہ یاد کرنے والے تھے اور وہ زمانہ بھی شامل ہے جس میں حضرت اقدس محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جن سے زیادہ ذکر کرنے والا نہ پہلے پیدا ہوا نہ آئندہ کبھی ہوسکتا ہے۔ تو اس زمانہ میں David Attenborough کا تو وجود ہی کوئی نہیں تھا، اس سائنس کا وجود نہیں تھا جس نے David Attenborough پیدا کئے، ان ایجادات کا کوئی تصور نہیں تھا جن کے ذریعے سے انسان کی خدا تعالیٰ کی ان صنعتوں تک رسائی ہوئی جن میں اس نے حیرت انگیز تخلیق کے کرشمے دیکھے۔

پس نماز تو ہر زمانے کے لئے ہے اور ذکرِ الٰہی ان ظاہری علوم کا محتاج نہیں مگر ذکر الٰہی اس اندرونی توجہ کا ضرور محتاج ہے جس کے نتیجے میں ہر جگہ انسان کو خدا ملنا شروع ہو جاتا ہے اور نظر میں گہرائی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے اور اپنے گرد و پیش جہاں دیکھتا ہے وہ خدا کے وجود کو وہاں جلوہ گر دیکھتا ہے اور جتنی بصیرت تیز ہو اور جتنی محبت بڑھے اُتنا ہی خدا کا وہ جلوہ زیادہ خوبصورت، دلکش اور دلربا دکھائی دینے لگتا ہے۔ پس عام دنیا کے دستور کے لحاظ سے بھی نماز میں اور خصوصاً سورۂ فاتحہ میں ہر انسان اپنی اپنی توفیق کے مطابق رنگ بھر سکتا ہے۔

حواسِ خمسہ کی مَیں نے بات کی ہے اب یہ بھی ایک بڑی دلچسپ غور طلب بات ہے کہ سورۂ فاتحہ میں رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے بعد الرَّحْمٰنِ کا ذکر فرمایا گیا اور الرَّحْمٰنِ پر غور کرنے سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ایسی ذات ہے (بے شمار اور بھی معانی ہیں لیکن ایک بڑا نمایاں معنی یہ ہے کہ) جس نے محض ضرورت سے بہت بڑھ کر دیا۔ محض ضرورت تو یہ ہے مثلاً کہ ایک انسان کی بھوک مٹ جائے اور اس کی غذا اس لحاظ سے مکمل ہو کہ اس کو زندگی کے قیام کے لئے اور زندگی کی نشوونما کے لئے جن کیمیاوی اجزاء کی ضرورت ہے وہ اسے متناسب شکل میں مہیا ہو جائیں۔ یہ زندگی کی محض ضرورت ہے اور یہ ضرورت بعض دفعہ Drips کی صورت میں بھی جس کے ذریعے مریضوں

کو خوراک پہنچائی جاتی ہے انسان کو مہیا ہو جاتی ہے۔ ایسے Concentrates کی صورت میں یعنی ایسی غذاؤں کے خلاصے کی شکل میں بھی انسان کو مہیا ہو جاتی ہے جس میں مزا کوئی نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو معمولی سا ہوتا ہے اور ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو اگر خدا تعالیٰ نے کائنات کو بعض ضرورتوں کی خاطر پیدا کرنا تھا تو محض اس طرح بھی پیدا فرما سکتا تھا کہ ہر چیز کی ضرورت پوری ہو جائے اور خدا نے تخلیق کا گویا حق ادا کر دیا لیکن ہر جگہ آپ کو رحمانیت جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔

حواسِ خمسہ پر آپ غور کر کے دیکھیں یہ تو ہر انسان کے بس میں ہے۔ اس کے لئے کسی علم کی ضرورت نہیں۔ ہر انسان سے مراد وہ ہے جسے حواسِ خمسہ عطا ہوں اور اگر حواس خمسہ عطا نہ ہوں تو چار حواس عطا ہوں تو ان کے ذریعے بھی انسان اسی قسم کی معرفت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ تین ہوں تو اُن تین کے ذریعے انسان اپنی توفیق کے مطابق خدا تک پہنچ سکتا ہے مگر حواسِ خمسہ ہوں یا چار حواس ہوں یا تین ہوں یا دو یا ایک، زندگی میں کوئی ایسا زندگی کا حصہ آپ کو دکھائی نہیں دے گا جو حواس سے عاری ہو اور اگر حواس سے عاری ہے تو وہ موت ہے۔ پس انسان ہی نہیں بلکہ اس کی ادنیٰ حالتیں بھی حواس کے ذریعے خدا تک پہنچتی ہیں اور جہاں تک انسان کا تعلق ہے اگر وہ محض اس پہلو سے غور کرے کہ میری ہر حس میں اللہ تعالیٰ نے محض ضرورت پوری نہیں فرمائی بلکہ اس سے بہت بڑھ کر رکھا ہے۔ ناک کو خوشبو کی یا بُو کے احساس کی ضرورت ہے وہ اس لئے ہے کہ بعض زہریلی اور گندی چیزوں سے انسان بچ سکے لیکن اس میں لذت کیوں رکھ دی۔ بعض چیزوں میں لذت کیوں رکھ دی گئی؟ سوال تو یہ ہے۔ اس کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ بعض جانور اس حد تک وہ قوت رکھتے ہیں جو شامہ کہلاتی ہے یعنی سونگھنے کی قوت کہ وہ اپنی ضرورت کی چیز کو پہچان لیں اور جو چیز اُن کے لئے مُضر ہو سکتی ہے اس کو پہچان کر اس سے دور ہٹ سکیں۔ یہ ہے بنیادی ضرورت جسے میں محض ضرورت کہتا ہوں لیکن ہر جانور کو خدا تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ لذت بھی عطا کر دی ہے۔ جو انسان تک پہنچتے پہنچتے درجۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ نظر کی محض ضرورت یہ ہے کہ آپ رستہ دیکھ سکیں چیزوں کو نہ صرف دیکھ سکیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو اس کے فاصلے دیکھ سکیں۔ چیزوں کو اس حد تک پہچان سکیں کہ کون سی آپ کے لئے مفید ہیں اور کون سی مُضر ہیں۔ کہاں ٹھوکر ہے کہاں صاف رستہ ہے۔ غرضیکہ ''محض ضرورت'' کی زندگی کی بہت سی روزمرہ کی ایسی حالتیں ہیں جنہیں نظر پورا کرتی ہے لیکن نظر کے ساتھ لذت رکھ دی اور اس

لذت کو ایسی طاقت بخشی ہے کہ انسان حسن کی تلاش میں زندگی بسر کر دیتا ہے۔ شعراء نظر سے تعلق رکھنے والی لذت کا اپنے کلام میں ذکر کرتے ہیں۔ ساری زندگی اس بات پر صرف کر دیتے ہیں کہ ہم نے حسن کو اس طرح جلوہ گر دیکھا، اس طرح جلوہ کر دیکھا۔ کھانے کی لذت سے ہر انسان آشنا ہے اور اگر محض ایسا کھانا ملے جو اس کی ضروریات پوری کرتا ہو لیکن لذتیں زیادہ مہیا نہ کر سکے تو انسان بیزار ہو جاتا ہے۔ بعض گھروں میں اس وجہ سے میاں بیوی کی لڑائیاں طلاق تک پہنچ جاتی ہیں کہ بیوی کو کھانا نہیں اچھا پکانا آتا۔ ہر روز کی بک جھک، بک جھک ہوتے ہوتے بالآخر نفرتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور خاوند کہتا رہتا ہے کہ تُو تو ہے ہی بے سلیقہ۔ تیرے ہاتھ میں تو مزہ ہی کوئی نہیں حالانکہ جہاں تک جسم کی ضرورت کا تعلق ہے وہ تو اُسے مہیا ہو رہی تھی۔ اسی طرح آپ اپنے دیگر حواس پر غور کریں تو کم سے کم ضرورت بہت تھوڑی تھی اس سے بہت زیادہ عطا کیا گیا ہے اور اس عطا کرنے کی صفت کا نام جو ضرورت حقّہ سے زیادہ ہو رحمانیت ہے۔

پس جب آپ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتے ہیں اور ربوبیت کے نظارے اپنے ذہن میں تصویر کی طرح گھماتے ہیں تو اپنے گرد و پیش اپنی ذات میں، اپنی اولاد کی صورت میں، اپنے ماں باپ کی صورت میں، اپنے دوستوں کی صورت میں، اپنے معلمین کی صورت میں ہر طرف سے آپ کو ربوبیت کے نظارے مختلف شکلوں میں دکھائی دینے لگیں گے اور جس دن کی جو نماز ہے اس دن جو خاص ربوبیت کا اثر دل پر پڑنے والی بات ہے وہ نمایاں طور پر اپنے ذہن میں آپ حاضر کر سکتے ہیں اور روزمرہ کے بدلتے ہوئے تجارب کے ساتھ ساتھ ربوبیت کے مختلف نقشے آپ کے ذہن میں اُبھر سکتے ہیں اور جب آپ رحمانیت میں داخل ہوں تو آپ کے حواس خمسہ نے اُس دن آپ کو جو بھی لذت پہنچائی ہے وہ لذت حمد میں تبدیل ہو جائے گی۔ آپ اُس وقت نماز پڑھتے ہوئے یہ سوچ سکتے ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ ایسا عجیب ہے میرا رب کہ ساری کائنات کا نظام اُس نے سنبھالا ہوا ہے۔ تمام کائنات کی ربوبیت فرما رہا ہے اور کسی کے حال سے کسی کی ضرورتوں سے غافل نہیں ہے لیکن ضرورتیں ایسی پوری کرتا ہے کہ ضرورت پورا کرتے وقت ضرورت سے زیادہ یعنی کم سے کم ضرورت سے زیادہ لذتیں عطا کر دیتا ہے۔ پس اگر چہ رحمانیت کا مضمون یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اسے آغاز کہنا بھی درست نہیں ہوگا کیونکہ رحمانیت کے ذکر میں یہ

بات ایک بہت ہی معمولی حیثیت رکھتی ہے لیکن سوچ کا ایک طریقہ ہے جو مَیں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ اس طرح آپ سورۃ فاتحہ پر غور کرنا شروع کریں اور پھر رحمانیت پر غور کر کے رحیمیت پر آئیں اور وہاں جا کر دیکھیں کہ اور باتوں کے علاوہ رحیمیت میں بار بار دینے کا مفہوم ہے اور اس رنگ میں بار بار دینے کا مفہوم ہے کہ محنت ضائع نہ جائے بلکہ زیادہ ہو کر واپس ملے تو ساری کائنات میں رحیمیت پھیلی ہوئی دکھائی دینے لگے گی۔ ایک پہلو سے جب آپ خدا کو دیکھتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ باقی ساری صفات غائب ہوگئی ہیں وہی اصل صفت تھی لیکن ربوبیت سے جب رحمانیت میں داخل ہوتے ہیں تو ہر طرف رحمان خدا کا نظارہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ رحمانیت سے جب رحیمیت میں جاتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں کہ کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جہاں رحیمیت کارفرما نہ ہو۔ انسانی جسم کے تمام اجزاء میں اور انسان کے تمام ارکان میں، اُس کے اعضاء میں ہر چیز سے جو انسان بنا ہوا ہے انسان رحیمیت کے سبق پڑھ سکتا ہے۔ گرد و پیش پر دیکھیں، ایک زمیندار کو بڑے علم کی ضرورت نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ میں موسموں سے فائدہ اُٹھاتا ہوں اور موسم آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایک موسم میں کھود یتا ہوں تو اگلا موسم دوبارہ وہی مواقع لے کر میرے حضور حاضر ہو جاتا ہے اُس موسم سے میں فائدہ اُٹھاتا ہوں اور پھر وہ موسم نکل جاتا ہے تو مَیں سوچتا ہوں کہ یہ کمی رہ گئی ہے وہ کمی رہ گئی لیکن پھر وہ دوبارہ چکر لگاتا ہوا میرے پاس پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے اچھا اب کمیاں پوری کرلو۔ موسم کے بار بار آنے میں کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن اس سے فائدہ اُٹھانے میں کمی رہ جاتی ہے۔

پس بعض لوگ ایسے ہیں جن کا رحیمیت سے تعلق اس طالب علم کی طرح ہوتا ہے جو ہر امتحان کے وقت سوچتا ہے کہ جو ہو چکا وہ ہو چکا اگلے امتحان کی دفعہ میں یہ سب تیاریاں کروں گا تا کہ یہ نقص بھی نہ رہے، یہ نقص بھی نہ رہے اور اگلا امتحان پھر بھی آتا ہے لیکن وہ پھر تیاریوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ تو استفادہ کرنے کا کام ہمارا ہے لیکن جہاں تک افادہ کا تعلق ہے فائدہ پہنچانے کا تعلق ہے، رحیمیت ہر بار اپنے سب جلوے لے کر آتی ہے اور بار بار آتی ہے، رحیمیت کا مضمون بھی اتنا وسیع ہے کہ ایک خطبہ چھوڑ بیسیوں خطبات میں بھی مضمون کی نشاندہی بھی پوری نہیں کی جاسکتی لیکن یہ مثال میں نے آپ کے سامنے رکھی ہے کہ اس مثال پر غور کرتے ہوئے اپنے علم کو بڑھائیں، اپنے عرفان کو بڑھائیں، کسی بیرونی علم کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آپ کے حواس خمسہ یہ اہلیت رکھتے ہیں کہ آپ کو

خدا تک پہنچا دیں لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ آپ کے اندر خدا تک پہنچنے کی طلب پیدا ہو۔ اگر طلب پیدا ہو جائے تو پھر آپ کو اس بات کا عرفان حاصل ہوگا کہ دراصل آپ خدا تک نہیں پہنچتے خدا آپ تک پہنچتا ہے۔ حواسِ خمسہ کے ذریعے آپ ہر چیز تک پہنچ جاتے ہیں لیکن خدا کی توفیق کے بغیر خدا کو پا نہیں سکتے۔ پس ثابت ہوا کہ حواسِ خمسہ بذاتِ خود خدا تعالیٰ تک پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتے امکانات پیدا کرتے ہیں۔ اب ان دو چیزوں میں بڑا فرق ہے۔ جیسا کہ مَیں نے پہلے مثال دی تھی بڑے بڑے علماء دنیا میں موجود ہیں جو سائنس کے ایسے ماہرین ہیں کہ خدا تعالیٰ کی تخلیق کی باریک در باریک چیزوں تک ان کی نگاہ پہنچتی ہے اور جہاں پہنچ کر ٹھہرتی ہے وہاں ان کو یہ پیغام دیتی ہے کہ ابھی تم نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا اس سے پرے علم کے اور بھی جہان ہیں۔ پس نہ صرف یہ کہ وہ نظر رکھتے ہیں بلکہ نظر کے اندر عمق رکھتے ہیں، گہرائی رکھتے ہیں اور پھر بھی خدا تک نہیں پہنچتے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ (الانعام:۱۰۴) قرآن کریم فرماتا ہے کہ تمہاری آنکھیں، تمہاری بصارت خدا تک نہیں پہنچ سکتی هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ہاں وہ ہے جو تمہاری قوتِ ادراک تک پہنچتا ہے۔ کتنا عظیم الشان نکتہ اس میں بیان فرما دیا گیا اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی عظمت و لطافت اور اس کا اعلیٰ ہونا اور اس کا عظیم ہونا اور اس کا اکبر ہونا یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو انسانی حواسِ خمسہ کو ناکام کر دیتی ہیں کہ انسان محض ان کے زور سے خدا کی عظمت کو پالے اس کے علوم کو پالے، اس کی کبریائی کو پالے اور اس کی ذات کی گہرائی تک اُتر سکے۔ پس سطحوں تک جا کر ہمارے حواس ٹھہر جاتے ہیں۔

اس کے بعد پھر اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ چیز جو ہمیں بظاہر دکھائی دے رہی ہے یہ بڑی پیاری ہے لیکن اس کے پیچھے کوئی اور ذات چھپی ہوئی ہے۔ پس ہم اس کی عبادت کریں۔ جب اس کی عبادت کرتے ہیں اور حمد کو اس کے ساتھ ملاتے ہیں تو پھر وہ ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ حمد کی توفیق بھی اسی سے ملتی ہے۔ پس اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے یہ مضمون مکمل ہو جاتا ہے۔ پس حواسِ خمسہ کے ذریعے آپ کوشش کریں لیکن ساتھ یہ دعا کرتے رہیں کہ اے اللہ تعالیٰ! اے خدا!! تو ہمارے حواسِ خمسہ پر نازل ہو۔ ان پر جلوہ فرما کیونکہ جب تک تو اپنی صفات کا جلوہ ہم پر نہیں فرماتا اُس وقت تک ہم دیکھتے ہوئے بھی

دیکھنے سے محروم رہیں گے۔ ہم سنتے ہوئے بھی سننے سے محروم رہیں گے۔ ہم چکھتے ہوئے بھی چکھنے سے محرم رہیں گے اور اپنی کسی حسّ کے ذریعے بھی تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

مؤمن جب اِس عجز کے مقام پر فائز ہوتا ہے تو پھر اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی دعا میں ایک طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ عجز میں ایک طاقت ہے اور کبر میں ناطاقتی پائی جاتی ہے۔ جب بھی انسان خدا سے تعلق باندھتا ہے تو یاد رکھے کہ وہاں طاقت کا نام عجز ہے یعنی اپنی کمزوریوں کا احساس اور اپنی بڑائی کا احساس کمزوری ہے جس کے بعد انسان خدا سے تعلق کاٹ لیتا ہے۔ پس حواسِ خمسہ کی نااہلی کو دیکھنے کے لئے آپ کو کہیں بہت دُور کے سفر کی ضرورت نہیں۔ اہلیت رکھتے ہوئے بھی ان میں ایک نااہلیت پائی جاتی ہے۔ پس دنیا کی عظیم قوموں کو آپ دیکھیں جو خدا تعالیٰ کی تخلیق پر غور کرتے ہوئے، اس تخلیق میں چھپے ہوئے رازوں سے استفادہ کرتے ہوئے عظیم الشان ایجادات کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں اور وہ قومیں آج تمام دنیا پر غالب ہیں لیکن ان کا بھاری حصّہ ایسا ہے اور بہت بھاری حصّہ ایسا ہے جو خدا کے تصور سے ناآشنا ہے اور ذاتی طور پر خدا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، خدا کے تصور کا ایک ایسا مبہم سا سایہ ان کے ذہنوں پر پڑا ہوتا ہے جو تعلق قائم کرنے کے لئے کافی نہیں۔ ایک فرضی سا خیال ہے اور ایک کثیر تعداد ان میں سے ایسی ہے جو باشعور طور پر یہ اعلان کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ خدا نہیں ہے۔ ایسے بھی بڑے بڑے سائنس دان ہیں جنہوں نے بے انتہاء تفحص کیا اور قدرت کے بہت بڑے بڑے عظیم راز پالئے اور سب کچھ پانے کے بعد یہ کہہ کر سب کچھ گنوا بیٹھے کہ ہم نے تو ہر طرف دیکھا ہمیں تو خدا کہیں دکھائی نہیں دیا۔

پس جب مَیں حواسِ خمسہ کی بات کرتا ہوں تو وہ کھڑکیاں ہیں، دروازے ہیں جہاں تک روشنی پہنچ سکتی ہے مگر دروازے اور کھڑکیاں اچھل اچھل کر روشنیوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ روشنی ان تک پہنچتی ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور:۳۶) خدا زمین و آسمان کا نور ہے اور اَور معانی کے علاوہ ایک یہ معنی ہیں کہ تم آنکھیں کھولو، نور خود تم تک پہنچے گا اگر تم نور کی طلب کرنے والے ہو گے اور نور کی خواہش رکھنے والے ہو۔ اگر تم نور کی خواہش رکھو گے تو آنکھیں کھولو گے اور کھولو گے تو ہر طرف سے خدا کے جلوے تم تک پہنچنے لگیں گے اور اگر آنکھیں رکھتے ہوئے آنکھیں بند رکھو گے تو اندرونی طور پر تم میں بظاہر صلاحیت ہوگی لیکن نور تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ پس حواس خمسہ تو ہر شخص

کو عطا ہوئے اور حواسِ خمسہ کے مضامین پر اگر انسان غور کرتا ہے تو سورۂ فاتحہ میں اس کو بہت ہی خوبصورت رنگ بھرتے ہوئے دکھائی دیں گے اور خدا کی حمد اُس کے اندر اس غور وخوض کے بعد کیفیت پیدا کرے گی یا کیفیتیں پیدا کرے گی اور انہیں کیفیتوں کا نام نماز ہے۔ ان ہی کیفیتوں کا نام عبادت ہے۔ اس عبادت کے بعد جب آپ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہتے ہیں تو بلا تردّد یقین کے ساتھ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا سے پھر ضرور مدد ملے گی لیکن دوسرے دروازے بند کرنے پڑتے ہیں۔ ان معنوں میں بند کرنے پڑتے ہیں کہ آخری یقین بلا شرکتِ غیرے یہی رہتا ہے کہ صرف ایک ذات ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔

اس مضمون پر غور کرتے ہوئے جب آپ واپس خدا تعالیٰ کی اُن چار صفات کی طرف واپس جاتے ہیں جن کا سورۂ فاتحہ میں ذکر ہے تو تعجب پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں تو یہ بتایا گیا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہو اور یہی چار صفات ہیں جو بنیادی طور پر خدا کا تعارف کروانے کے لئے کافی ہیں لیکن ان میں بہت سی صفات موجود ہی نہیں ہیں۔ ہم جب کہہ دیتے ہیں کہ ہم صرف تیری عبادت کریں گے اور صرف تجھ سے ہی مانگیں گے اگر ہماری ضرورتیں اور ہوں اور زائد ہوں تو یہ عہد تو ہمارے لئے موت کا پیغام بن جائے گا۔ آپ ایک محدود طاقت والے انسان سے یہ رشتہ باندھ بیٹھیں جس کی طاقتیں بھی محدود ہیں، جس کی پہنچ محدود ہے۔ جو ہمیشہ رہ بھی نہیں سکتا اُس سے یہ عہد کر بیٹھیں کہ مَیں جو کچھ مانگوں گا تجھ سے ہی مانگوں گا تو جب اس کی ضرورت دینے والے کی طاقت سے باہر ہوگی وہیں وہ مارا گیا۔

ایک دفعہ ایک عباسی وزیر نے جو عباسی خلیفہ کے وزیر تھے کسی کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا تو اس نے احسان کا شکریہ اس رنگ میں ادا کیا کہ اس سے تحریری معاہدہ کیا کہ اے وزیر! مَیں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آئندہ مَیں تیرے دروازے کے سوا کسی دروازے کی طرف نہیں دیکھوں گا اور تیرے سوا کسی سے نہیں مانگوں گا لیکن کچھ عرصے کے بعد نہ وہ وزیر رہا نہ وہ در رہا اور یہ وعدہ از خود ہی جھوٹا ثابت ہو گیا۔ پس جب ہم اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ کہتے ہیں تو غور طلب بات یہ ہے کہ آیا یہ حکمت کی بات تھی بھی کہ نہیں۔ کہیں ہم ایسا عہد تو نہیں کر بیٹھے جس کے نتیجے میں بعض ہماری ضرورتیں خدا کی ذات سے باہر رہ جائیں گی اور جب ذات کی طرف واپس

لوٹتے ہیں تو وہاں صرف چار صفات ہیں۔ ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت۔ اب کیا ان چاروں صفات سے انسان کا گزارا ہوسکتا ہے۔ علم کا یہاں کہیں ذکر نہیں کہ خدا عالم الغیب بھی ہے۔ اس بات پر غور کرتے ہوئے وہ مضمون ذہن میں اُبھرتا ہے جس کا مَیں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ درحقیقت یہ چاروں صفات اُمّ الصفات ہیں اور کوئی ایک صفت بھی ایسی نہیں جو ان کے اثر سے باہر ہو۔ بعض دفعہ ایک صفت سے کئی دوسری صفات پیدا ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ مختلف صفات مل کر بعض صفات پیدا کرتی ہیں اور آپس میں ان کے تعلقات کے ادلنے بدلنے سے نئے مضامین اُبھرتے ہیں اور بعض دفعہ ہماری نظر نہیں ہوتی کہ ہم ایک صفت میں دوسری صفات موجود دیکھ سکیں لیکن موجود ہوتی ہیں اور قرآن کریم کا مطالعہ ہماری توجہ ان کی طرف مبذول کرواتا ہے اور بتاتا ہے کہ دیکھو اس کھڑکی کے رستے یہ روشنی بھی دکھائی دینی چاہئے تھی مگر دکھائی نہیں دی۔ مگر قرآن کریم مددگار بنتا ہے اور سارے قرآن کریم کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت ایک یقین کے طور پر دل میں ہمیشہ کے لئے جاگزیں ہو جاتی ہے کہ سورۂ فاتحہ کو اُم الصفات کہنا محض ایک جذباتیت کی بات نہیں تھی، ایک جذباتی تعلق کے نتیجے میں نہیں تھا بلکہ گہرے ٹھوس علم کے نتیجے میں ہے اور یہی حقیقت ہے۔ مثلاً مَیں نے علم کا ذکر کیا کہ خدا کو ہم سورۂ فاتحہ کے علاوہ جانتے ہیں کہ عالم الغیب ہے، عالم الشھادۃ ہے اور حاضر کو جانتا ہے، غائب کو جانتا ہے، ماضی کو بھی جانتا ہے، مستقبل کو بھی جانتا ہے لیکن سورۂ فاتحہ میں تو کوئی ایسا ذکر نہیں ملتا۔ پھر انسان قرآن کریم کے مطالعہ میں یہ بات پڑھ کر اچانک حیران رہ جاتا ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۲﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۳﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (الرحمٰن: ۲ تا ۵) کہ یہ رحمان ہے جس نے قرآن سکھایا۔ اب رحمانیت کا علم سے کوئی تعلق ہے ورنہ رحمان کو قرآن سکھانے والا کیوں قرار دے دیا گیا۔ یہ کہنا چاہئے تھا کہ علّام الغیوب ہے، عالم ہے، علیم ہے جس نے قرآن سکھایا۔ کیونکہ علم سکھانے والے کو تو عالم کہا جاتا ہے یا علیم کہا جاتا ہے یا علّامہ کہا جاتا ہے۔ رحمان تو نہیں کہا جاتا تو رحمانیت میں علم کا کون سا جزو پایا جاتا ہے یا کونسی مشابہت ان صفات میں پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم جو تمام علوم میں سب سے زیادہ جامع ہے اور سب سے اونچا مقام رکھتا ہے اور سب سے زیادہ گہرائی رکھتا ہے اس کو علیم کی طرف منسوب کرنے کی بجائے رحمان کی طرف منسوب کر دیا۔

اس مضمون پر غور کرتے ہوئے جب آپ رحمانیت میں سفر شروع کرتے ہیں تو آپ یہ سوچ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ ربوبیت بہت وسیع طور پر اثر انداز دکھائی دیتی ہے اور قانون قدرت اور تخلیق میں کارفرما نظر آتی ہے لیکن جب کچھ بھی نہ ہو تو رحمانیت کے سوا کسی چیز کا آغاز ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ رحمٰن کے اندر بن مانگے دینے والے کا معنی پایا جاتا ہے یعنی ابھی سائل کا وجود ہی پیدا نہیں ہوا۔ کوئی کچھ مانگنے کے لئے دربار میں حاضر نہیں ہوا لیکن اس کے لئے عطا کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ پس حقیقت میں تخلیق کا بھی رحمانیت کے ساتھ تعلق ہے اور علم کا بھی رحمانیت کے ساتھ تعلق ہے۔ تخلیق کا تعلق تو آپ کو فوراً سمجھ آ گیا، جب آپ دوبارہ اس آیت پر غور کریں تو آپ کو سمجھ آ جائے گی کہ رحمان کے ساتھ تخلیق کو کیوں باندھا تھا۔ اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۲﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۳﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۵﴾ کہ رحمان نے انسان کی تخلیق کی ہے اور رحمان ہی تھا جس نے قرآن عطا کیا۔ تخلیق کے لئے رحمانیت کا جوڑ سمجھنے کے لئے خدا تعالیٰ نے انسان کی بہترین مثال پیش فرما دی۔ انسان تخلیق کی وہ آخری شکل ہے جس میں سب سے زیادہ رحمانیت جلوہ گر ہے کیونکہ انسان کو سب سے زیادہ وہ چیزیں عطا ہوئی ہیں جو بن مانگے عطا ہوئیں اور جو درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی ہیں۔ کوئی اور مخلوق اس میں انسان کا مقابلہ نہیں کرتی بلکہ تمام کائنات کا خلاصہ انسان ہے۔ تو خَلَقَ الْاِنْسَانَ کا فاعل رحمان قرار دے دینا اور یہ فرمانا کہ رحمان نے انسان کی تخلیق کی ہے، نہ صرف ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تخلیق کا آغاز رحمانیت کے نتیجے میں ہوا ہے بلکہ تخلیق پر غور کرنے سے سمجھ آ جاتی ہے کہ کیوں رحمان کو خالق کہا گیا کیونکہ وہی مضمون دوبارہ اُبھرتا ہے جو مَیں نے آپ سے پہلے بیان کیا ہے کہ ہر تخلیق میں ضرورتِ واجبی کے علاوہ چیزیں عطا کی گئی ہیں۔ ضرورتِ حقہ کا لفظ مَیں نے پہلے استعمال کیا تھا غالباً ضرورتِ واجبی کہنا زیادہ درست ہے یعنی وہ ضرورت جو کم سے کم ہے جس کے پورا ہو جانے کے بعد چیز کو بقاء نصیب ہو جاتی ہے اور پیاس بجھ جاتی ہے۔ وہ ضرورت پورا کرنے کے بعد اگر مزید کچھ عطا کیا جائے تو وہ واجبی ضرورت سے زیادہ ہے اور اس کے لئے رحمان کا ہونا ضروری ہے ورنہ آپ روزمرہ کی زندگی میں تو رحمٰن نہیں بنتے۔ مزدور نے جب آپ کا کوئی کام کیا ہو تو بالعموم انسان کم سے کم دے کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ اکثر مالکوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ نوکروں بیچاروں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں کہ تمہاری ضرورت پوری

ہوگئی بس کافی ہے، تم اس میں رہ سکتے ہو۔ سردی سے بچ سکتے ہو، گرمی سے کسی حد تک بچ سکتے ہو بلکہ واجبی ضرورت بھی پوری نہیں کی جاتی کسی حد تک پوری ہو جائے تو سمجھتے ہیں کہ ذمہ داری ادا ہوگئی۔ وہ تو رحمان نہیں کہلا سکتے۔ پس تخلیق میں کوئی بھی زندگی کا ایسا ذرّہ آپ کو دکھائی نہیں دے گا خواہ وہ زندگی کی کسی نوع سے تعلق رکھنے والا ذرّہ ہو جس ذرّے کے اندر بھی رحمانیت کا جلوہ دکھائی نہ دیتا ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

؎ بنا سکتا نہیں اِک پاؤں کیڑے کا بشر ہرگز
تو پھر کیونکر بنانا نورِ حق کا اُس پہ آسان ہے (درثمین: ۴)

اب کیڑے کا پاؤں بنانے پر انسان قادر نہیں۔ یہ بات آج کے زمانے میں عجیب لگتی ہے۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ ہوائی جہاز ایجاد ہو گئے، ٹیلی ویژنز ایجاد ہو گئیں۔ حیرت انگیز باریک در باریک صفاتِ کائنات پر غور کرنے کے نتیجے میں انسان باریک در باریک چیزیں بنانے پر قادر ہوتا چلا جا رہا ہے تو کیا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ مصرعہ اب پُرانے زمانے کی بات بن گیا کہ

؎ بنا سکتا نہیں اک پاؤں کیڑے کا بشر ہرگز

لیکن جب آپ گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو آپ یہ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں کہ بڑی بڑی تخلیق اور عظیم تخلیق اور باریک در باریک تخلیق کا دعویٰ کرنے والا انسان بھی آج تک کیڑے کا ایک پاؤں بنانے سے عاجز ہے کیونکہ کیڑے کے ایک پاؤں میں عجیب در عجیب چیزیں بنی ہوئی ہیں۔ کیڑے کا ایک پاؤں جس مسالے سے بنا ہوا ہے جس طرح اس کے اندر انرجی Energy پہنچانے کا انتظام ہے، جس طرح وہ اپنے ظاہری حجم کے مقابل پر بیسیوں گنا زیادہ وزن اُٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ جس طرح اس کے اندر باریک در باریک اعصاب ہیں۔ جس طرح وہ اس بات کا اہل بنایا گیا ہے کہ سیدھی، عمودی چیزوں پر بھی وہ چڑھ جائے اور عام سطح پر بھی اسی طرح دوڑنے لگے جس طرح بعض اُن میں سے پانی کی سطح پر بھی دوڑنے کی استطاعت رکھتے ہیں اس کیڑے کے پاؤں پر آپ غور کریں تو عقل دنگ رہ جائے گی اور بغیر کسی شک کے ایک انسان جو صاحب علم ہو اور صاحب فراست ہو وہ دوبارہ یہ اعلان کرے گا اور ہزار بار یہ اعلان کرے گا:

؎ بنا سکتا نہیں اک پاؤں کیڑے کا بشر ہرگز

تو خدا تعالیٰ کی صنعتوں میں تو ہر جگہ رحمانیت جلوہ گر دکھائی دیتی ہے اور رحمانیت کو تخلیق میں ڈھالنے کے لئے علم کی ضرورت ہے کیونکہ تخلیق میں سائنس بھی ہے اور ٹیکنالوجی بھی ہے۔ یہ دو چیزیں اکٹھی ہو کر تخلیق میں ڈھلتی ہیں۔ علم کے بغیر تخلیق ممکن ہی نہیں ہے۔ پس علم جب درجۂ کمال کو پہنچا ہو تب تخلیق خوبصورت ہوتی ہے اور اس کے باوجود تخلیق کوئی عملی جامہ نہیں اوڑھ سکتی یا عمل کی صورت میں ڈھل نہیں سکتی جب تک ساتھ ٹیکنالوجی بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کو، رحمان خدا کو علم کے بغیر رحمانیت کو تخلیق میں ڈھالنے کی استطاعت ہی نہیں ہو سکتی تھی اور سب سے زیادہ عالم وہ ہوتا ہے جو چیز کو خود بنانے والا ہے۔ دوسرے بھی سمجھتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی کے بنائے ہوئے ماڈل پر غور کرتے ہیں اور گہرائی میں اُترنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جو بنانے والا ہے اس سے بڑھ کر عالم دُنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ پس رحمان میں ہی علم بھی شامل ہے اور رحمان ہی میں تخلیق بھی شامل ہے۔

پس جب ہم کہتے ہیں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو بلا شبہ کوئی ناقص سودا نہیں کر رہے ہوتے۔ کوئی خوف والا سودا نہیں کر رہے ہوتے۔ کامل یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس سے ہم نے یہ عہد کیا ہے کہ صرف تیری عبادت کریں گے اور کسی اور کو عبادت کے لائق نہیں سمجھیں گے ہم پورے یقین اور عرفان کے ساتھ یہ عہد کر رہے ہیں۔ ان کا یہ مطالبہ ایک طبعی آواز ہے جو اس کے پیچھے آنی چاہئے کہ اے ہمارے معبود! پھر ہماری ضرورتیں بھی تو ہی پوری کرنا کیونکہ تو تمام ضرورتیں پوری کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مضامین ہیں مگر اب چونکہ وقت ختم ہو رہا ہے اگر وقت مِلا میں انشاء اللہ اسی مضمون پر مزید گفتگو اگلے خطبے میں کروں گا اور اگر بیچ میں ایسا کوئی اور امر زیادہ فوری توجہ کے لائق آیا تو پھر ایک خطبے کا ناغہ کر کے پھر انشاء اللہ آئندہ خطبے میں اس مضمون کی طرف آؤں گا تا کہ لوگ جو ہر وقت ہمیشہ پوچھتے رہتے ہیں کہ آپ نے کچھ بتایا تھا لیکن ابھی پیاس نہیں بجھی کچھ اور بتائیں۔ نمازوں کو ہم کس طرح زندہ کریں تو جہاں تک خدا مجھے توفیق عطا فرمائے میں چاہتا ہوں کہ اس ذمہ داری کو ادا کر دوں اور آپ کو نمازوں کو زندہ کرنے کے کچھ راز سمجھا دوں۔ اگر ہماری نمازیں زندہ ہو جائیں تو ہم زندہ ہوں گے اور ساری انسانیت زندہ ہوگی کیونکہ عبادت کی زندگی کے سوا انسان کو زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ دیکھتے ہوئے بھی اندھا رہے گا۔ وہ سنتے ہوئے بھی بہرا رہے گا وہ بظاہر بولنے کی طاقت رکھے گا مگر بیان سے خالی ہوگا کیونکہ

اس کے بیان کا رحمانیت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ پس یہ بہت ہی اہم بات ہے۔ زندگی کی تمام اہم چیزوں میں سب سے زیادہ اہم عبادت ہے مگر وہ عبادت جسے سمجھ کر ادا کیا جائے، جو کیفیتوں میں ڈھلنی شروع ہو جائے اور کیفیتوں سے بھر جائے اس سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور وہ زندگی پھر تمام کائنات کو زندہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین